ارض القرآن کا سفر

از: محمد عاصم

(۲)

بحرین سے خُبر ۱۰ نومبر کی صبح ہمارا پروگرام بحرین سے الخُبر (سعودی عرب) جانے کا تھا۔ بحرین سے ہر دو گھنٹے کے بعد ایک ہوائی جہاز ظہران روانہ ہوتا ہے اور صرف دس منٹ میں وہاں پہنچ جاتا ہے جہاز اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ اس میں کل دس بارہ آدمیوں کی جگہ ہوتی ہے۔ کرایہ ۲۳ روپے فی کس ہوتا ہے۔ ہر مسافر کو اپنے ساتھ ۲۰ کیلو (تقریباً ۲۶ سیر) سامان رکھنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس سے زائد سامان کا کرایہ دینا پڑتا ہے۔ ہمارے پاس چونکہ سامان زیادہ تھا اس لیے یہ طے پایا کہ مولانا قمر اسماعیل خاں صاحب کے ساتھ ہوائی جہاز سے سفر کریں اور میں سامان لے کر بذریعہ لانچ خُبر پہنچ جاؤں۔ میری اجنبیت کے خیال سے بحرین کے ایک عرب دوست میرے ساتھ جانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ مولانا ۹½ بجے کے ہوائی جہاز سے روانہ ہو گئے اور میں اپنے بحرینی دوست کے ساتھ سامان لے کر بندرگاہ پہنچ گیا۔ میرے پاسپورٹ پر بحرین سے 'خروج' کی مہر بھی وہیں بندرگاہ پر لگ گئی اور اس کے بعد ہم اپنا سامان لے کر لانچ پر سوار ہو گئے۔ لانچ والے نے ہم سے ۶ روپے فی کس وصول کیے اور ہم پونے بارہ بجے کے قریب خُبر کے لیے روانہ ہو گئے۔ بحرین سے خُبر کا فاصلہ تقریباً پچیس میل ہے اور عام طور پر لانچ یہ فاصلہ چار گھنٹوں میں طے کرتا ہے لیکن ہماری خوش قسمتی کہ اس دن سمندر میں ہوا کا رُخ مشرق سے مغرب کو (یعنی جس سمت کو ہم جا رہے تھے) تھا۔ اس لیے ہم چار گھنٹے کے بجائے صرف ڈھائی گھنٹے میں پہنچ گئے۔ راستے میں سمندر اتنا کم گہرا تھا کہ بعض جگہ پانی کے نیچے سے زمین صاف نظر آ رہی تھی۔ اسی راستہ میں ہمیں بحرین کا تیسرا جزیرہ بھی ملا، جو بہت چھوٹا سا ہے اور اس پر کوئی آبادی نہیں ہے۔

بحرین کے قریب سعودی عرب کے مشرقی ساحل پر تین بندرگاہیں ہیں۔ ایک خُبر جو ایک معمولی سی بندرگاہ ہے اور یہاں سے صرف مسافر لانچوں کے ذریعے بحرین آتے جاتے ہیں۔ دوسری دمام جو خُبر سے شمال کی طرف دس بارہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں مال برداری کے جہاز آکر ٹھہرتے ہیں اور چونکہ اس کے قریب پانی گہرا نہیں ہے، اس لیے تمام جہاز سمندر میں تین چار میل دور ٹھہرتے ہیں اور وہاں سے لانچوں کے ذریعے سامان بندرگاہ پر آتا ہے۔ لیکن اب سعودی حکومت اس جگہ سے سمندر کے اندر پتھر ڈال کر گیارہ میل لمبا ایک خشک راستہ بنا رہی ہے جس پر ریل کی پٹری بھی بچھائی جا رہی ہے۔ جب یہ راستہ اور ریل کی پٹری مکمل ہو جائے گی تو کئی کئی جہاز یہاں آکر ٹھہر سکیں گے اور جہازوں سے براہِ راست سامان ملک کے اندر آنا جانا شروع ہو جائے گا۔ دمام سے ریاض تک ریلوے لائن پہلے سے موجود ہے اور اس پر اب بھی گاڑیاں چلتی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایسی صورت میں دمام غالباً ایشیا کی سب سے بڑی بندرگاہ بن جائے گا۔ تیسری راس تنورہ جو دمام سے تقریباً تیس میل کے فاصلہ پر شمال مشرق کی طرف واقع ہے۔ یہاں صرف تیل کے جہاز آکر ٹھہرتے ہیں اور یہیں سے آرامکو کے تیل کا بڑا حصہ جہازوں میں لد کر باہر کے ملکوں کو جاتا ہے۔

یوں تو ہم، جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، دو بجے کے قریب خُبر پہنچ گئے، لیکن پہنچ جانے کے باوجود تین بجے تک ہمیں لانچ کے اندر ہی رہنا پڑا، کیونکہ بندرگاہ پر جن کلرک صاحب کی لانچ سے متعلق ڈیوٹی تھی، وہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ جب تک وہ واپس تشریف نہیں لے آئے، مسافروں کو زمین پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ پھر میرے ساتھ ایک لطیفہ یہ بھی پیش آیا کہ میرا پاسپورٹ چونکہ پاکستانی تھا اور مجھے عمرہ کے لیے خُبر سے ریاض اور ریاض سے مکہ معظمہ جانا تھا، اس لیے مجھے حکم ملا کہ آج کی گاڑی تو جا چکی، اس لیے کل گاڑی کے وقت تک یہیں بندرگاہ پر رہو، کیونکہ جو غیر سعودی مسافر مکہ معظمہ جانے کے لیے خُبر کے راستے سے آتے ہیں، انہیں شہر میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں۔ یہ تو خیریت رہی کہ میں نے چلتے وقت مولانا سے سعودی سفیر

کا وہ خط لے لیا تھا جو انہوں نے جدہ پر سعودی افسران کے نام دستی طور پر ہمیں دیا تھا۔ میں نے جب یہ خط ان کلرک صاحب کو دکھایا تو ان کی سختی نرمی میں تبدیل ہو گئی اور انہوں نے مجھے بندرگاہ سے شہر جانے کی اجازت دے دی۔ انہوں نے مجھ سے پچاس ریال (تقریباً ۷۰ روپے) بھی وصول فرمائے جو ہر غیر سعودی کو سعودی حکومت میں داخل ہوتے وقت ادا کرنے پڑتے ہیں۔ راؤ محمد اختر صاحب سے، جو مجھے لینے کے لیے وہاں پہنچ گئے تھے، معلوم ہوا کہ انہوں نے پچاس ریال مولانا کی طرف سے بھی ایئرپورٹ پر ادا کیے ہیں۔ کسٹم پر مجھ کو کوئی دقت پیش نہیں آئی، اگرچہ میرے ساتھ کچھ کتابیں تھیں اور ان میں سے بعض کتابیں، ان لوگوں کی اصطلاح کے مطابق مذہبی کتابیں تھیں لیکن کسٹم آفیسر صاحب نے ان کتابوں پر شک و شبہ کی نگاہ نہیں ڈالی، کیونکہ بعض کتابوں کے دیکھنے سے انہیں یہ اندازہ ہو گیا کہ میں بھی ایک سلفی العقیدہ آدمی ہوں۔ اس لیے انہوں نے میری سختی سے تلاشی لینا ضروری نہ سمجھا۔ مجھے بھی سب سے زیادہ ڈر کتابوں ہی کی تلاشی کا تھا۔ کیونکہ کتابوں کی تلاشی کے سلسلہ میں گذشتہ سفر (۱۹۵۶ء) میں جدہ کے ہوائی اڈہ پر جو پریشانی ہوئی تھی، وہ مجھے خوب یاد تھی۔ دنیا کے دوسرے ملکوں میں غیر مذہبی کتابوں کی تو خوب جانچ پڑتال ہوتی ہے، لیکن مذہبی کتابوں پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا۔ سعودی عرب کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہاں دوسری کتابوں کا تو یوں سمجھیے کہ کوئی نوٹس ہی نہیں لیا جاتا، لیکن مذہب اور خصوصاً عقائد سے متعلق کتابوں کو بڑے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات جب کسٹم والے خود ان کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے، تو انہیں تحقیق کے لیے علماء کے پاس بھیج دیتے ہیں، یعنی جب تک علماء انہیں ناقابلِ اعتراض قرار نہ دے دیں، انہیں ملک کے اندر داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔

راؤ محمد اختر صاحب کے ایک دوست اپنی کار لے آئے تھے۔ کسٹم سے فارغ ہونے کے بعد اس کار میں سوار ہو کر ہم راؤ صاحب کے مکان پر پہنچے۔ وہیں مولانا مقیم تھے اور ان کے پاس ملاقات کرنے والوں کی ایک جماعت موجود تھی جن میں کچھ عرب بھی تھے، لیکن اکثریت ان پاکستانی

باشندوں کی تھی، جو آرامکو کی ملازمت کے سلسلے میں وہاں مقیم ہیں۔ یہ سب لوگ ایک جگہ نہیں رہتے بلکہ ان میں سے بعض خُبَر میں رہتے ہیں، بعض ظہران میں، بعض دمّام میں، بعض راس تنورہ میں، بعض بُقیق میں اور بعض دوسرے مقامات پر۔ پاکستانیوں کی مجموعی تعداد آرامکو کے ان مراکز میں اس وقت بارہ سو کے قریب ہے، لیکن یہ تعداد دن بدن کم ہوتی جارہی ہے، کیونکہ یہاں بھی حکومت کی طرف سے کمپنی پر دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ وہ "اجانب" (FOREIGNERS) کو جلد سے جلد رخصت کرے اور ان کی جگہوں پر سعودی عرب یا دوسرے عرب ملکوں کے باشندوں کو متعین کرے۔ عرب قومیت کا یہ اثر ہے کہ سعودی حکومت کی نظر میں سب سے مقدم سعودی ہے، پھر دوسرے عرب اور پھر دنیا بھر کے باشندے، جن میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ اس پالیسی کے تحت لوگوں کا خیال ہے کہ زیادہ سے زیادہ ۶۲ء تک تمام پاکستانیوں کو کمپنی کی ملازمت سے رخصت کردیا جائے گا۔ سعودی حکومت اپنے طلبہ کو بڑے زور شور سے انگریزی تعلیم اور فنی تعلیم دلا رہی ہے۔ اگرچہ ابھی کئی سال تک یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ سعودی باشندے اس قابل ہوسکیں گے کہ اجانب کو رخصت کرکے تمام آسامیاں خود سنبھال سکیں۔

مغرب کی نماز ہم نے محلہ کی مسجد میں پڑھی۔ مسجد نئی بنی ہوئی تھی اور سادگی کے ساتھ نہایت پختہ، کشادہ اور خوبصورت۔ معلوم ہوا کہ سعودی حکومت نے خُبَر، دمّام، ظہران، راس تنورہ، بُقیق کی تمام بستیوں اور کمپنی کے ملازمین کے تمام کوارٹروں میں ایسی مسجدیں تعمیر کرائی ہیں اور ان کے تمام مصارف بھی خود برداشت کررہی ہے۔ مسجدوں کا ذکر آیا تو قارئین کے لیے یہ بات غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ تمام عرب ممالک میں ہمارے ہاں کی طرح مسجدوں میں وضو وغیرہ کا انتظام نہیں ہوتا۔ تمام لوگ اپنے اپنے گھروں سے وضو کرکے مسجد آتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ تمام عرب ممالک میں لوگ جوتے پہنے پہنے مسجدوں میں بے دھڑک چلے آتے ہیں اور صرف نماز پڑھنے سے پیشتر چٹائی یا دری کے قریب جوتے اتار دیتے ہیں۔ بلکہ بعض تو اس وقت بھی جوتے نہیں اتارتے اور جوتوں سمیت نماز پڑھ لیتے ہیں۔ یہ چیز اگرچہ تمام عرب ملکوں میں مشترک ہے، لیکن سعودی عرب خصوصاً

نجد کے باشندے تو اس میں انتہائی غلو برتتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسجد میں جوتا پہن کر داخل ہونا جائز ہے اور بکثرت موقعوں پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے مسجد کے اندر جوتوں کے ساتھ نماز پڑھی ہے لیکن ایسا صرف ضرورت کے تحت ہی ہوا ہے۔ اگر مسجد کا فرش پختہ نہ ہو یا دھوپ سے گرم ہو رہا ہو تو جوتا پہن کر مسجد میں داخل ہوا جا سکتا ہے اور جوتوں کے ساتھ نماز بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ لیکن پختہ فرش اور بہترین قسم کی چٹائیوں اور دریوں کی موجودگی میں بھی جوتے لیکر مسجد میں داخل ہونا اور جوتوں سمیت نماز پڑھنا خواہ مخواہ کی زیادتی اور ہٹ دھرمی ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں ہر حال میں مسجدوں کے اندر جوتے پہن کر جانے اور جوتوں سمیت نماز پڑھنے کو مسجد اور نماز کے احترام کے منافی خیال کیا جاتا ہے۔ بلکہ اگر کوئی شخص میدان میں بھی جوتوں سمیت نماز پڑھ لے تو اس پر سخت اعتراض کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اعتدال کی راہ دونوں کے درمیان ہے۔

مسجد کے امام صاحب ایک نجدی نوجوان تھے، جو ابھی ابھی ریاض کے کسی مدرسہ سے فارغ ہو کر آتے تھے۔ وہ نماز پڑھانے کھڑے ہوتے تو تکبیر تحریمہ سے پہلے جیب سے مسواک نکال کر کرنے لگے اور پھر اسی طرح انہوں نے جیب میں مسواک ڈال کر نماز شروع کی۔ نماز اتنی تیز پڑھائی کہ ہم لوگوں کے لیے ان کا ساتھ دینا بڑا مشکل تھا۔ قرآن اس طرح روکھے سوکھے بلکہ غلط طریقہ پر پڑھا کہ ہمیں نہ صرف اس سننے سے کوئی لطف نہیں آیا بلکہ سخت کوفت ہوئی۔ مولانا کے بقول ہمارے دیہات کے ملا بھی ان سے اچھا قرآن پڑھتے اور سکون سے نماز پڑھاتے ہیں۔ ہمارے پاکستانی احباب نے بتایا کہ یہ امام صاحب تو پھر بھی قرآن مجید غنیمت پڑھتے ہیں، ورنہ یہاں کی دوسری مسجدوں کا حال تو اس سے بھی بُرا ہے۔ ایک طرف تو مصریوں، شامیوں اور عراقیوں کی یہ "تری" ہے کہ وہ قرآن مجید کو بھی قوالوں کی طرح "گا کر" پڑھتے ہیں اور دوسری طرف نجدی حضرات کی یہ "خشکی" کہ ان کے بڑے بڑے علما تک گویا قرآن مجید کو صحیح مخارج اور عمدہ آواز کے ساتھ پڑھنا بدعت سمجھتے ہیں۔ پھر نجدی حضرات کی ایک "خصوصیت" یہ بھی ہے کہ جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو کبھی سکون سے کھڑے نہیں ہوتے، کبھی اپنے کپڑے ٹھیک کرنے لگ جاتے ہیں اور کبھی انہیں یاد آتا ہے کہ ان کے کرتے کے بٹن بند نہیں ہیں

یا ان کے سرکا رومال ٹیڑھا ہو گیا ہے اور وہ اسے ٹھیک کرنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض لوگ تو نماز کے دوران گھڑی پر وقت دیکھنے میں بھی کوئی ہرج نہیں محسوس کرتے۔ یہ سب باتیں اگرچہ ہمارے لیے نئی نہیں تھیں اور پہلے بھی ہمیں ان کا تجربہ تھا، لیکن اس سفر میں چونکہ پہلی مرتبہ بار بار ان کا مشاہدہ ہو رہا تھا، اس لیے ہمیں سخت کوفت ہو رہی تھی۔ مولانا تو رات گئے تک بار بار ان کا ذکر کرتے رہے۔

راس تنورہ اگلے دن ۱۱ نومبر کو شاہ سعود کی تخت نشینی کی سالگرہ تھی اور اسی لیے کمپنی کے تمام ملازمین کو تین دن کی چھٹی تھی۔ یہ لوگ خوش تھے کہ چھٹیاں ایسے موقع پر آئی ہیں جبکہ مولانا بھی تشریف لاتے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے ہماری ملاقاتوں یا یوں کہیے کہ دورے کا ایک باقاعدہ پروگرام بنایا جس کے تحت ہم اس روز صبح نو بجے راس تنورہ گئے، جو خُبَر سے شمال مشرق کی طرف تقریباً چالیس میل کے فاصلہ پر سعودی عرب کی ایک بندرگاہ ہے اور یہاں سے آرامکو کے تیل کا بڑا حصہ جہازوں میں لد کر بیرونی ممالک کو جاتا ہے اور یہاں کمپنی کی سب سے بڑی ریفائنری بھی ہے۔ خُبَر سے راس تنورہ تک ساری سڑک نہایت عمدہ بنی ہوئی ہے کیونکہ کمپنی بہادر کی بنائی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں موٹے موٹے پائپ لائن بھی نظر آئے جن کے ذریعے ظہران اور دوسری جگہوں سے پٹرول راس تنورہ کی ریفائنری میں پہنچتا ہے۔ راستے میں ایک گاؤں آیا جس کے متعلق ہمارے ساتھیوں نے بتایا کہ اس میں حضرت یسع علیہ السلام کی قبر بتائی جاتی ہے، لیکن ہمیں حضرت یسع علیہ السلام کی قبر کے یہاں ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ حضرت یسع علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے اور فلسطین ہی کے علاقہ میں بود و باش رکھتے تھے۔

راس تنورہ پہنچے، تو پاکستان اور ہندوستان کے ملازمین کمپنی کے کوارٹروں میں ایک جگہ ڈیڑھ دو سو کے قریب پڑھے لکھے نوجوان جمع تھے اور مولانا کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ سلام اور تعارف کے بعد ان کے اور مولانا کے درمیان سوالات و جوابات کا سلسلہ شروع ہوا جو ½ ۱۰ بجے سے ¾ ۱۲ بجے تک جاری رہا۔ تمام سوالات نہایت سنجیدہ اور علمی انداز کے تھے۔ مولانا بھی موڈ میں نظر آ رہے تھے۔ ہر سوال کا جواب، نہایت اطمینان اور تفصیل کے ساتھ دے رہے تھے۔ زیادہ تر

سوالات سود، آسٹریلیا سے درآمد شدہ ڈبوں کے گوشت، زکوٰۃ، ضبطِ ولادت اور کرنسی کے تبادلہ کے متعلق تھے۔ یوں تو ان کے سارے ہی سوالات حقیقی ضروریات اور مشکلات کے تحت تھے لیکن جس مسئلہ نے ان کو سب سے زیادہ پریشان کر رکھا تھا، وہ تھا گوشت کا مسئلہ۔ کمپنی کے عرب ملازمین آسٹریلیا وغیرہ سے برآمد شدہ ڈبوں کا گوشت بے تکلف کھاتے ہیں اور اس میں کسی طرح کی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ غضب یہ ہے کہ کمپنی کی کنٹین میں سوٴر کے گوشت کے جو ڈبے فروخت ہوتے ہیں، وہ دوسرے گوشت کے ڈبوں کے ساتھ ملا کر رکھے ہوتے ہیں، اور ان پر صرف انگریزی میں PORK لکھا ہوتا ہے۔ بعض لوگ تو خیر جانتے بوجھتے یہ ڈبے خریدتے ہیں، لیکن اکثر یا تو انگریزی نہیں جانتے یا جانتے ہیں مگر PORK کا مطلب نہیں سمجھتے، اس لیے وہ غلطی سے یہ ڈبے خرید کر کھا لیتے ہیں۔ آسٹریلیا سے آیا ہوا یہ گوشت چونکہ یہاں کے گوشت کے مقابلہ میں بہت سستا ہوتا ہے اور صاف ستھرا بھی، اس لیے اس کی خوب فروخت ہوتی ہے۔ مولانا نے ان لوگوں کو اصل مسئلہ سمجھایا اور یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر موقع ملا تو ریاض کے علماء کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں گے۔

۱½ بجے وہیں کوارٹروں کی مسجد میں ہم نے ظہر کی نماز پڑھی۔ اس مسجد کے امام صاحب ایک پاکستانی پٹھان تھے جنہیں ان لوگوں نے خاص طور پر اپنی مسجد کی امامت کے لیے پاکستان سے بلایا تھا۔

سوا تین بجے سے سوا چار بجے تک پھر سوالات و جوابات کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دفعہ سوالات سنت، معیارِ حق، شیطان کی حقیقت وغیرہ موضوعات سے متعلق تھے۔ عصر کے بعد چائے پی اور پھر ہم لوگ وہ جگہ دیکھنے گئے جہاں جہازوں میں تیل لادا جاتا ہے۔ سمندر میں کئی جہاز کھڑے تھے۔ ان میں سے بعض جاپانی تھے، بعض امریکن اور بعض دوسرے ملکوں کے۔ بعض میں پائپ کے ذریعے تیل ڈالا جا رہا تھا اور بعض دور کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ قریب ہی ریفائنری تھی جس کے اندر تو اگرچہ ہم نہیں جا سکے، لیکن وہ باہر سے اچھی طرح نظر آ رہی تھی اور ہمارے ساتھی ہمیں اس کے متعلق دور ہی سے اشارہ کر کے بہت کچھ سمجھاتے رہے۔ بہت سی جگہوں پر زمین کو آگ لگی ہوئی تھی۔ ہمارے ساتھیوں نے بتایا کہ یہ وہ گیس ہے جو پٹرول کے ساتھ

ہوتی ہے۔ جب پٹرول کو صاف کیا جاتا ہے تو اس گیس کو فالتو اور بے کار سمجھ کر جلا دیا جاتا ہے اب بعض جگہوں پر کمپنی نے یہ طریقہ بھی اختیار کیا ہے کہ انجکشن کے ذریعے اس گیس کو زمین کے اندر پھر سے داخل کر دیا جاتا ہے تاکہ اس سے ایک تو تیل کا دباؤ برقرار رہے اور دوسرے یہ گیس اس وقت کے لیے محفوظ رہے جب تیل ختم ہو جائے گا۔ یہ تقریباً اسی طرح کی گیس ہے جو ہمارے ہاں پاکستان میں دریافت ہوئی ہے اور اسے سوئی گیس کہا جاتا ہے۔ مولانا نے بتایا کہ ۵۶ء میں حج سے واپسی پر جب ان کا ہوائی جہاز رات کے وقت ظہران کے قریب پہنچا، تو انہیں جگہ جگہ یہ گیس جلتی نظر آ رہی تھی۔

مغرب کی نماز ہم نے وہیں ایک مسجد میں پڑھی اور پھر ظہران کے راستے خبر واپس آگئے۔ ظہران خبر سے تین چار میل کے فاصلہ پر عرب امریکن آئل کمپنی (آرامکو) کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہاں کوئی شہر نہیں ہے اور نہ کوئی بازار۔ صرف کمپنی کا مرکزی دفتر ہے یا ملازمین کے رہائشی کوارٹر۔ ملازمین اپنی ضرورت کی تمام چیزیں یا تو خبر سے خریدتے ہیں یا دمام سے۔ رات کے وقت ظہران بڑا پرشکوہ نظر آ رہا تھا۔ نہایت اعلیٰ سڑکیں اور عمارتیں اور ان پر اس قدر روشنی کا انتظام کہ دیکھنے والے کو مشکل ہی سے یہ یقین آئے کہ پٹرول نکلنے سے پہلے یہاں چٹیل میدان اور ریت کے اونچے اونچے تودوں کے سوا کوئی چیز نہ پائی جاتی تھی۔ اب تو اگر ظہران کو نیویارک کا ایک ٹکڑا بھی کہا جائے، تو مبالغہ نہ ہوگا۔

راؤ صاحب کے گھر پہنچے تو چودھری غلام محمد صاحب کو ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے پایا۔ مولانا نے مزاحاً دریافت فرمایا کہ یہ کون چور ہے جو مالک مکان کی اجازت کے بغیر اندر گھس آیا ہے! چودھری صاحب نے بتایا کہ جب دوپہر کے وقت میں یہاں پہنچا، تو دیکھا کہ مکان کھلا پڑا ہے اور اس میں کوئی شخص نہیں ہے۔ میں اطمینان سے اندر گھس آیا اور ایک کمرے میں آکر سو رہا۔ اس وقت چودھری صاحب کے سر میں سخت درد ہو رہا تھا اور وہ نزلہ میں مبتلا تھے۔ بیچارے گزشتہ تمام کویت سے چلے تھے اور رات انہیں کویت اور سعودی عرب کی سرحد پر ایک کھلی جگہ زمین پر بستر لگا کر